پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

پاکستانی ثقافت

ثقافت کی ایک عام تعریف اب تک یہ کی جاتی رہی ہے کہ یہ لوگوں کے رہن سہن اور چلن کے طریقِ کار کا نام ہے۔ اس کی توضیح یہ کی جاتی رہی ہے کہ کسی ملت کی ثقافت اس ملت کے طرزِ بود و ماند، اکل و شرب، ملبوسات، رسم و رواج، ہنرہائے زیبا اور طرزِ تعمیر وغیرہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ عصرِ حاضر میں غالباً اس تعریف اور اس توضیح میں یہ اضافہ کرنا پڑے گا کہ مندرجہ بالا لوازم کے علاوہ ثقافت میں "طرزِ فکر" کا اہم عنصر بھی شامل ہے کیونکہ میرے نزدیک یہی وہ عنصر ہے جو ایک ملت کی ثقافت کو دوسری ملت کی ثقافت سے ممتاز کرتا ہے۔ اگلے وقتوں میں ننگے پاؤں پھرتا ہوا مدراسی اس پنجابی کے مقابلے میں نہایت آسانی سے پہچانا جاتا تھا جو تہبند باندھے ہوئے ہوتا تھا لیکن اب ریگزارِ عربستان کا باشندہ بوقتِ ضرورت اسی طرح سوٹ پہنتا ہے جس طرح انگلستان کا رہنے والا۔ علیٰ ہذا القیاس آب و ہوا کے تفاوت اور ضروریات کے اختلافات کی مجبوریوں کے علاوہ مکانات کی تعمیر، ان کا فرنیچر، خورد و نوش کا طریقہ، ملبوسات، یہاں تک کہ تفریح کے لوازم، تمام ملکوں میں تقریباً یکساں یا ہم رنگ ہیں، اور اگر دیانت داری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محولہ بالا قیود کی حدود میں فرنگی ثقافت ساری دنیا میں مقبول و معروف ہو رہی ہے۔ یعنی ثقافتی حدود میں جن ظواہر کو اپنایا جا رہا ہے وہ سالماً یا بیشتر فرنگی ہیں۔ آپ موصل کے خاک اور دھول سے اَٹے ہوئے بازاروں میں جائیں یا گراٹز (آسٹریا) کی شفاف سڑکوں پر گھومیں۔ ہر جگہ لوگ آپ کو ہیٹ اور سوٹ پہنے ہوئے اور میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے چھری کانٹے، چمچے سے کھانا کھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ارضِ روم کا ترک فرانسیسی، اور امریکی دھنوں سے اسی طرح محظوظ ہوتا دکھائی دے گا جیسے یوگوسلافی روسی ناچ سے۔

کہنا یہ مقصود ہے کہ جہاں تک ثقافتی ظواہر کا تعلق ہے ان کے متعلق بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا

ہے کہ فرنگی ظواہر نے مشرق اور مغرب کے دل کو لبھا لیا ہے اور اب کوٹ اور ٹائی ہر مہذب ملت کا قومی لباس بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں اگلے دن ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ جرمنی میں مستشرقین کے کنگرہ (کانگرس) میں ایک امریکی میرے ایک ایرانی دوست سے یہ پوچھنے پر مُصر تھا کہ تمھارا قومی لباس کیا ہے؟ ایرانی نے کہا "یہی جو میں پہنے کھڑا ہوں" امریکی نے کہا! یہ تو انگریزی لباس ہے۔ ایرانی نے کہا۔ میں تو کبھی انگلستان نہیں گیا اور بچپن سے یہی لباس پہن رہا ہوں۔ میرا باپ بھی یہی لباس پہنتا ہے اور میرے بچے بھی یہی لباس پہنتے ہیں۔ یہ کپڑا بھی ایران میں بنتا ہے اور اسے ایرانی درزی نے سیا ہے۔ امریکی کچھ کھسیانا ہو کر بولا لیکن یہ تو آپ کا رسمی یا کاروباری لباس ہے۔ آپ کا کوئی قومی لباس بھی تو ہوگا؟ ایرانی نے پھر اپنے کوٹ ٹائی، اور پتلون کو قومی لباس ہی کہا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنے دل کی بات نہ بتا سکے اور بات ختم ہوگئی۔ حقیقت یہ تھی کہ امریکی جو کبھی ایران نہیں گیا تھا یہ فرض کر رہا تھا کہ ایرانیوں کا ملی یا قومی لباس ان کے کاروباری لباس سے الگ ہے۔ اور ایرانی نوجوان اسے یہ سمجھا نہیں سکتا تھا کہ اس کے دادا کے زمانے میں ایران نے اپنا قدیم لباس اتار پھینکا تھا اور سیلاب کی مانند بڑھتی ہوئی یورپ کی تہذیب کے زیر اثر انھوں نے فرنگی لباس زیب تن کر لیا تھا۔ اور پھر نہ اس کے باپ کو یاد رہا تھا کہ نصف صدی پیشتر لوگ کیا اور کیسا لباس پہنتے تھے اور نہ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی عمر میں ان لوگوں کو دیکھا تھا جو لبادے پہنے ہوئے اصفہان کے بازاروں میں گدھوں پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ایران کے بازاروں میں تاکسی (ٹیکسی) چل رہی تھی جو چھ آنے لے کر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سوٹ پہنے ہوئے تین آدمیوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دیتی تھی۔ چنانچہ وہ ملی لباس فرنگی سوٹ کو ہی سمجھا ہے اور ملی سواری اس کے لیے تاکسی ہی ہے بے چاری دوشکہ دو گھوڑوں کی گاڑی ایک عرصہ ہوا ٹوٹ گئی اور اسے شہر تو ایک طرف دیہات سے بھی نکال دیا گیا ہے۔

پھر ان حالات میں فرنگی اور ایرانی ثقافت میں تفاوت معین کرنے یا پاکستانی ثقافت کی حدود پرکھنے کے لیے ظواہر سے ہٹ کر ان عناصر کو تلاش کرنا پڑے گا جو ان ثقافتوں

پر اپنا لیبل لگا رہے ہیں۔ مَیں نے ان عناصر کو "طرزِ فکر" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ میرا نظریہ ہے کہ پاکستانی سوٹ پہنے یا تہ بند، چھری کانٹے سے کھانا کھائے یا انگلیوں سے بہرصورت اس کے طرزِ فکر اور ایک فرنگی کے طرزِ فکر میں بنیادی تفاوت موجود ہوگا۔ جامعہ یا معاشرہ کے باغیوں کو چھوڑ دیئے وہ لاہور میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر امریکی دھنیں ریڈیو سے سُن کر محظوظ ہوتے ہیں اور ریڈیو پاکستان کی کلاسیکی موسیقی کے وقت (It is horrible) (یہ الم انگیز ہے) کہہ کر ریڈیو کو بند کر دیتے ہیں۔ یا شام کے کھانے پر سر بمہر ولایتی ڈبوں سے کچھوے کا شوربا ضرور نکال کر پیتے ہیں لیکن گائے کے گوشت سے انھیں اس لیے نفرت ہے کہ لاہور میں ذبح ہوتی ہے۔ مَیں عام پاکستانیوں کی بات کرتا ہوں اور ان کی تعداد نہ صرف زیادہ ہے، بلکہ دس ہزار میں سے نو ہزار نو سو ننانوے ہے۔ ان میں ولایت پلٹ پلٹ لوگ بھی شامل ہیں۔ ان سب کا طرزِ فکر بنیادی طور پر ایک سا ہے اور کچھ چیزوں سے انھیں یکساں طور پر نفرت و رغبت ہے۔ مثلاً یہ سب لوگ اپنے اپنے مالی وسائل کے مطابق ایک ہی طرح کے رسم و رواج کے پابند ہیں۔ عشق و معاشقہ کرنے والے افراد کی ملک میں کمی نہیں، لیکن ناطے اور شادی بیاہ تقریباً یکساں طریقے سے سرانجام پاتے ہیں۔ لڑکی پردہ نہ بھی کرتی ہو اور لڑکے سے شادی سے پہلے مل بھی چکی ہو۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ ایک دن آپ یہ خبر سن لیں کہ فلاں صاحب کی لڑکی نے آج فلاں مسجد میں جا کر فلاں صاحب کے لڑکے کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا ہے۔ وہی منگنی، سگائی، نکاح، برات اور رخصتی کے مراحل طے ہوں گے اور دُلہن میکے سے سُسرال جائے گی۔ لڑکے لڑکیاں انگریزی اسکولوں کی ہی تربیت اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں ماں کو You are silly, Mummy (امی! تم کودن ہو) نہیں کہہ سکیں گے۔ بیویاں کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں (نہایت اونچے درجے کے سوا) عام طور پر غیر مرد سے رقص کرنے سے گریز کریں گی۔ شراب بعض گھروں میں خاص موقعوں پہ استعمال ہوگی لیکن سفارتی اور سرکاری تقریبوں کے علاوہ ہر روز کثرت سے شراب پینے والے یا دالی کو پاکستانی "شرابی" کہہ کر پکاریں گے اور اس لقب میں نفرت اور حقارت کے کچھ اجزا بھی شامل ہوں گے۔ بعض مرد اور عورتیں کھلے بندوں مشروبات سے شغف کو مخصوص حلقوں تک محدود رکھیں گے اور ان کے علاوہ دوسری جگہوں پہ ان کے استعمال سے منکر ہو جائیں گے۔

عورتیں اور مرد الگ الگ اپنے اپنے انداز میں موسیقی اور گیت گانے سے محظوظ ہوں گے۔ لیکن دوسری محفل کی موجودگی میں اس کی نمائش نہیں کریں گے۔ مرد اور عورتیں ایک جگہ باہم مل کر بیٹھنے کے باوجود زود یا بدیر ذکور و اناث کے گروہوں میں منقسم ہو کر اپنے اپنے موضوعات پر گفتگو شروع کر دیں گے۔ اونچے طبقے کے مجمعوں میں عام مرد بہت سی عورتوں کے حسن کی داد بالمشافہ اس طرح نہیں دے سکیں گے جیسے فرنگی کے ہاں رواج ہے اور نہ ہی کوئی عورت ! How sweet you are, Honey (آپ کتنے شریں ہیں) بہت سے مردوں سے کہہ سکے گی۔ بڑی سرعت سے سرایت کرتی ہوئی عام سماجی بغاوت کے باوجود ابھی تک پاکستانی حفظ مراتب اور چھوٹے بڑے کا خیال رکھنے پر مجبور ہیں۔ ان سب چیزوں کا تعلق مخصوص طرزِ فکر سے ہے جو ہر پاکستانی کو خاص حالات میں ایک طرح کا عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے اور دوسرے پاکستانی اس مخصوص طرزِ فکر و عمل کو پسند کرتے ہیں۔ اس طرزِ فکر کی تفصیل، وضاحت اور نمونے پیش کیے جائیں تو مضمون بہت لمبا ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ جامعہ کا تجزیہ کریں تو آپ نہایت آسانی سے بعض انسانی خوبیوں پر یہ لیبل لگا سکیں گے کہ یہ پاکستانی طرز فکر و عمل ہے اور یہی پاکستانی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے چونکہ سرکاری اور اجتماعی طور پر کسی طرزِ فکر و عمل کو پاکستانی ثقافت کا نمائندہ قرار نہیں دیا گیا (اور یہ کام مشکل بھی ہے) اور وسیع پیمانے پر اس کی تبلیغ اور تدریس نہیں کی گئی اس لیے پاکستانی ثقافت کے بہت سے نمونے دستیاب نہیں ہوں گے۔ مثال کے طور پر عرض کروں گا کہ انگریز بچے کو ماں بچپن سے ہی یہ بتانا شروع کرتی ہے کہ تم اگر کسی اجنبی سے بات کرنا شروع کرو تو عمر اور مرتبے کا لحاظ کیے بغیر تم اسے (sir) (جناب) کہہ کر پکارو۔ چونکہ اس طرزِ فکر و عمل کی تشہیر، تبلیغ اور تدریس صدیوں سے ہو رہی ہے اس لیے یہ طرزِ عمل ہر انگریز کی عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ یکساں طرز فکر و عمل کو رائج کرنے اور مقبول بنانے کے لیے تشہیر، تبلیغ اور تدریس کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری ملت میں ابھی تک اس ضرورت کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی ثقافت کا سراغ نکالنا اور کسی طرز فکر و عمل پہ پاکستانی ثقافت کا لیبل لگانا آسان کام نہیں۔ ہر انسانی ذہن نہ تو اس قدر پختہ کار نہ ہی اس قدر زیرک ہوتا ہے کہ دوسروں کو اچھے کام کرتے ہوئے دیکھ کر از خود نقالی کر کے ان کی خوبیاں اپنے اندر جذب کر لے۔ عام آدمیوں کو تبلیغ، تدریس اور

بعض دفعہ فہمائش کی ضرورت ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اس تدریس کا خانہ خالی ہے اور اجتماعی اداروں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں انسانی خوبیاں یعنی پاکستانی ثقافت کی مستحسن علامات سرعت سے مقبول نہیں ہو رہیں اور ہر آدمی اجتماعی پابندیوں سے آزاد رہ کر اور ثقافت کی اہمیت نہ سمجھتے ہوئے ہر طرح کے طرزِ فکر و عمل کو اپنا لیتا ہے، اور پاکستانی ثقافت کا بوٹا جس کی جڑیں صدیوں پرانی روایات میں گڑھی ہوئی ہیں پھل پھول کر تناور درخت نہیں بن سکتا۔

بلکہ پاکستانی ثقافت کے مثبت اور مستحکم پہلوؤں کی کمزوری کی وجہ سے معاشرہ میں ایک اس قسم کا انتشار ہے جو سیاسی، اجتماعی اور مذہبی اقدار کو ہر وقت متزلزل کیے رکھتا ہے۔ یہ انگریزی ثقافت کی علامت ہے کہ جب انگلستان کے ایک وزیرِ خزانہ کے بجٹ کی کچھ تفاصیل بجٹ پیش اور منظور ہونے سے پیشتر پردۂ اخفا سے باہر آجاتی ہیں تو وہ اسے اپنے مرتبہ کے لیے ایک گھٹیا بات سمجھ کر اور خفیف ہو کر اس عہدہ سے از خود سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات پاکستانی سیاست کا ثقافتی پہلو ہے کہ کچھ لوگ جو اپنی رقیب جماعت کے مسلک سے کسی طرح متفق نہیں محض وزارتی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے اس جماعت سے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اور ان سے مل کر حکومت بنا لیتے ہیں۔ انگلستان میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دو مختلف جماعتوں نے مل کر حکومت بنائی ہے لیکن اس وقت ہوا جب ملک کی سالمیت کو خطرہ میں دیکھ کر احزاب مخالف نے ملک کا متحدہ دفاع کرنے کی نیت سے یہ کام کیا ہے لیکن پاکستانی ثقافت اور سیاسی لیڈروں میں اس طرح کی بلند نظری اور معیاری ہدف بینی کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔

اسی طرح سے اور کئی ملتوں میں لوگ ملی اور اجتماعی منافع کے لیئے ذاتی اور انفرادی بہبود سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرہ میں اس کے بالکل بر خلاف ہو رہا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں ثقافتی طور پر اس کے کردار کے معائب کی توضیح نہیں کی گئی۔ حق پرستی، حق گوئی اور حق پسندی کو بھی ہماری ثقافت میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ملک میں انتشار، دوست نوازی اور چور بازاری کا بازار گرم ہے۔ بلکہ ان معائب کو اس قدر نظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ایک طرف تو لوگ ان کو بڑے شوق سے کردار کا حصّہ بنا رہے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کو حق

اور بے وقوف بھی سمجھتے ہیں جو ان کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔

یہ پاکستانی ثقافت کا مایوس کن رُخ ہے لیکن حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ ثقافت یوں تو ایک مضبوط اور تناور درخت ہوتا ہے جس کی جڑیں بھی بسا اوقات روایات کے پاتال تک پہنچتی ہیں لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ ایسا درخت ہوتا ہے جس پر ہر بہار میں نئے پھول لگتے ہیں کیونکہ اس درخت کو سیراب کرنے کے لیے ہر زمانے میں بدلے ہوئے حالات کا پانی فراہم ہوتا رہتا ہے۔ اگر دس سال پیشتر ایک قسم کا طرزِ فکر اور عمل اور کردار پاکستانی ملت کو پسند تھا تو دس سال کے بعد ایک اور طرز فکر اور عمل اور کردار بھی ان کو پسند آ سکتا ہے۔ اگر آج لوگ ننگ و ناموس کو تج کر صرف ترقی کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو کل ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو صرف ننگ و ناموس کے تحفظ کے لیے دنیا کی تمام ترقیوں کو تج دیں گے۔ اس بات کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ثقافت کوئی جامد چیز نہیں۔ یہ آگے بڑھتی ہے اور بلندیوں تک پہنچتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ کبھی بہت پیچھے ہٹ جاتی ہے اور گڑھوں میں جا گرتی ہے۔ اور اگر آپ یہ تسلیم کر لیں تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ رفتار کی روز افزوں سرعت اور وسائل حمل و نقل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ایک بین الملی اور بین الاقوامی ثقافت اُبھرتی آئے گی جس کے خدوخال اور ظواہر ساری دنیا میں تقریباً یکساں اور ہم رنگ ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہر علاقہ اور ہر ملت اس میں مقامی اور ملی عناصر کی رنگ آمیزی سے اسے اپنے ساتھ منسوب کیا کریں گے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ عمل جاری ہو چکا ہے اور ایک بین الملی ثقافت پیدا ہو چکی ہے جس کے رنگوں کے کچھ سائے پاکستانی ثقافت میں مدغم ہو رہے ہیں اور پاکستانی ثقافت بہت تیزی سے بین الملی ثقافت کا روپ دھار رہی ہے۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اگر پاکستانی ثقافت بین الملی ثقافت کے رنگ اختیار کر رہی ہے تو پاکستانی ثقافت کا اثر اُبھرتی ہوئی بین الملی ثقافت پر کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میں کہوں گا کہ یوں بھی ہو رہا ہے۔ اگر پاکستانی ثقافت مغربی ثقافت سے متاثر ہو رہی ہے تو کم از کم ظواہر کے اعتبار سے پاکستانی ثقافت کا اثر بھی دوسری ملتوں پر پڑ رہا ہے۔ صرف دو مثالیں عرض کروں گا۔ یورپ اور سرزمین مغرب میں نہ جانے کب سے یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ وہ قمیص یعنی جسم کے اوپر کے حصے کے لباس کے نچلے سرے کو ہمیشہ پاجامہ یا پتلون یعنی جسم کے نیچے کے حصے کے لباس

کے اندر چھپا کر رکھتے تھے، اور اکثر اس بات کا مذاق اُڑاتے تھے کہ ہندوستانی (اور اب پاکستانی) قمیص کے نچلے سرے کو شلوار سے باہر لٹکائے رکھتے تھے۔ لیکن گذشتہ عالم گیر جنگ کے زمانے میں مغربیوں کو اس علاقہ میں طویل عرصہ تک رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ گرم علاقوں میں اس رسم کی پابندی فرحت بخش ہے۔ چنانچہ اسی احساس سے بوشرٹ کی ایجاد ہوئی جو قمیص کی ایک دوسری شکل ہے لیکن اس کا نچلا حصہ پتلون سے باہر رہتا ہے۔ گویا مشرق کا ایک ثقافتی عنصر جو پہلے قابلِ تضحیک گردانا گیا تھا۔ اب مغرب والوں کو بہت پسند آگیا ہے۔ اسی طرح ہمارے کھانوں پر نووارد مغربی لوگ ہنسا کرتے تھے اور بالخصوص سرخ مرچ سے بہت گھبراتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ سرخ مرچ اور پلاؤ انھیں کچھ اس قدر پسند آیا کہ میں نے حالیہ دَورے میں یورپ کے کسی نہ کسی ہوٹل میں ان کو موجود پایا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ مغربی اقوام پلاؤ پر تو فدا ہیں۔ البتہ مرچ کا چسکا کہیں کہیں پڑا ہے۔

ان مثالوں سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اعلیٰ ثقافتیں یا ثقافتوں کے اعلیٰ عناصر بین الملّی روابط بڑھنے پر ہمیشہ ادنیٰ عناصر کو (Superior culture elements) متاثر کرتے ہیں۔ مغربی لوگوں کے ہاں چاول سے تیار کردہ ایسی کوئی خوراک نہیں جو پاکستانی پلاؤ کا مقابلہ کر سکے۔ لہٰذا مغربی لوگ پاکستانی ثقافت کے دیگر عناصر سے متاثر نہ ہونے کے باوجود پاکستانی پلاؤ سے ضرور متاثر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعلیٰ غذا ہے اور پاکستانی چھری اور کانٹے کی طرف اس لیے مائل نظر آتے ہیں کہ یہ کھانا کھانے کا بہتر اور آرام دہ طریقہ ہے۔ بشرطیکہ چھری اور کانٹے صاف اور پاک ہوں۔

اس مثال سے ہمیں اس بات کی ترغیب بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم پاکستانی ثقافت کو سربلند اور مقبول دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں ان عناصر کو شامل کرنا پڑے گا جو دنیا کے ہر انسان کے لیے دل کشی کا باعث ہوں۔ انسانی اقدار اور بود و ماند کے ظواہر ہمیں اس معیار کے منتخب کرنے پڑیں گے جو دنیا کے لیے ایک نمونے کا کام دیں اور بین الملّی ثقافت کے رائج اور مرسوم ہو جانے کے باوجود ان سے متعلق کم از کم ہم فخریہ طور پر یہ کہہ سکیں کہ اس ثقافت میں فلاں مخصوص عناصر ہماری ثقافت سے اخذ کر کے شامل کیے گئے ہیں۔

لیکن اس مقصد کی تحصیل کے لیے ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ منصوبہ کون تیار کرے اور اس پر عمل کیسے ہو؟ ان سوالات کا جواب ابھی تک نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن کہتا ہے کہ اگر لوگوں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا تو اس کی عملی راہیں بھی بہت جلد سوجھ جائیں گی۔

حیاتِ محمدؐ

از محمد حسین ہیکل — مترجم ابو یحییٰ امام خاں

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب اور محقق محمد حسین ہیکل کی مشہور و معروف تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات نہایت موثر اور دل نشین انداز میں لکھے گئے ہیں اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے ان پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق زندگی کے بنیادی حقائق اور اس دور کے اہم مسائل سے ہے۔ قیمت: ۲۲٫۵۰ روپے

اسلام کے چند معاشی مسائل

سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربٰو، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور کتاب و سنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائجِ فکر شستہ اور سلیس انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن ۵ روپے — عمدہ ایڈیشن ۶٫۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور